

# بایا بگلوس

گرم سے بچنے لہرئے شہر کی اہلیتی رات میں ایک بدن کو پنجوڑ کر جخ کر دینے والی  
چیخ کا گرم سیسہ کا نوں میں اُڑتا۔ بابیے بگلوس نے کروٹ بدلتی۔ ایک اور چیخ کا گرم  
پتھر اس کی کھوڑی پر گرا اور شہنڈا ہو گیا۔ پھر بیکے بعد دیگرے کئی چیزوں کے دلکھتے  
اوے اس کے بدن پر بر سے کیا مصیبت ہے۔ عمارت کے اہل کا رآخرات  
کے وقت ہی کیل اقبال جرم کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ بابا  
بگلوس سونا چاہتا ہے۔ وہ شب کرٹیں بدلتے میں ہی گزدی۔

”عایت پتہ! بڑی سر کارنے تو رات بھر سونے نہیں دیا“ دھوپ کے پہلے  
بر چھے زمین میں کھینچنے سے پشیر تابے بگلوس نے اپنی چار پائی کو ٹھٹھی میں سے  
برآمدے میں گھسیٹی اور نل پر منہ ہاتھ دھوتے سپاہی سے شکایت آمیز بول رہے  
لیجھے میں کہا۔

عنایت مساک منزہ سے نکال کر ایک بیسی تھوڑکے برلا۔ بابا ٹبی سرکار تو درنے پر گئی ہر ہی ہے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ باجے نے بے لیقینی میں سرٹاپا یا ”ساری رات چیزوں کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ ایسی خوفناک چیزوں جو صرف بڑی سرکار کا چھتری انساز کے تمام سوراخوں میں سے باہر نکالتا ہے۔“

عنایت نے پانی کی بیک منزہ میں اندھیل کر لیتی آسمان کی جانب کر دی اور اس کے حق میں سے گر رگر کی آوازیں آنے لگیں جیسے موڑ سائیکل کا پلکب شارت ہو جائے تو انہن ٹک ٹک کر چلتی ہے۔

”چج کھد رہا ہوں عنایت ساری رات .....“ بابا بدستور سرٹاپا رہا۔

”وہ چیزوں اس عمارت میں سے نہیں آ رہی تھیں بابا۔ اور ویسے بھی ہمارے خاص کمرے تو سائونڈ پروف ہیں۔“

”میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ باجے نے چھلا کر کہا۔

”گرمی مت کھایا کر د بابا۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے چیزوں کی آوازیں سنی نہیں.....“ عنایت ہنسنے لگا بیا اور پھر آنکھ مار کر برلا۔ دراصل تھیں سمت کا اندازہ نہیں ہو سکا چیزوں کی آواز آ رہی تھی مگر اس عمارت میں سے نہیں بلکہ باہر شرکی طرف سے۔“

”شرکی طرف سے؟“

”اہ اب چیزوں کی آوازیں اوصرے ہی آیا کرتی ہیں۔“

”کوئی نیابندی غاہ تھل گیا ہے؟“

”کوئی ایک .....“ عنایت نے مساک منزہ میں ٹھونسی اور اپنی بیرک میں چلا گیا۔ باجے بگوس نے اپنا سفید بگلا سرکھلا یا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈر بہن ماتھگ کو ٹھٹر لیں، بیرکوں، وفتروں، تھاؤں اور اونچی اونچی دلیاں

میں بھرے چکور حسنی کا یہ مجموعہ شہر سے باہر ایک تاریخی عمارت کے ایک ایسے گونے میں پوشیدہ تھا جس کے پہلو میں لیٹی ہوئی مرکز پر سے گرتے تھے سیاہیں اور عالم شہریوں کو یہ گھان بھی نہ ہوتا کہ وہ وہاں موجود ہے، اور وہ وہاں موجود تھا۔ لوگ پنک کی ٹوکریاں اٹھاتے، کیسے لٹکاتے صرف بلند دیواروں کو دیکھتے اور ماضی کے باوشا ہوں کی عظمت کا دباؤ سینے پر محسوس کرتے ہوئے آتے بڑھ جاتے۔ یہ عمارت باتا معاudemہ قسم کا قید خاد نہیں تھی، مجرموں کو صرف عارضی طور پر بیان لایا جاتا تھا۔ صرف ایسے مجرم جن کے جرم کا حوالہ کوئی قانونی کتاب میں نہیں ملتا تھا۔ آغاز بڑی سرکار کے چھتر سے ہوتا جوان کو ہمارا کرتا اور پھر حدیثیں دوڑا مددشہ آلات ان کے جسموں پر باندھ کر یا ان کے سودا اخوں میں فٹ کر کے ان سے اقبال جرم کروالیا جاتا۔ بشیر قیدی اپنے جرم کی اُس تفصیل پر فوراً دعظت کر دیتے جو بڑی سرکار کی بڑی سرکار نے بسی ہوتی تھی۔ مگر کچھ گند ذہن ان آلات میں بجڑے ہوئے سپورٹ میں پیرٹ کو بالائے طاق رکھ کر یہیہ مر جاتے اور ہر ان کی لاشیں بلند دیواروں سے چھینک کر اعلان کر دیا جاتا کہ اسفل نے خود کشی کر لی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اتنی گند ذہنیت کا مظاہرہ خود کشی ہی تو ہے جب کہ صرف دستخط کرنے سے انسان زندہ رہ سکتا ہو۔

یہ عمارت ایک عرصے سے بیان موجود تھی۔ حزب مخالف کے سیاسی راستہ اب اس کو نہیں دیکھ لیں میں لائے جاتے تو وہ برف کی سلوں پر بندھے ہوتے خلوص دل سے ان کو نہیں دیکھ لیتے کہ جو منی حکومت کی باگ ڈوراں کے ہاتھوں میں آئے گی وہ اس مخصوص تھیکر لیتے کہ جو منی حکومت کی باگ ڈوراں کے ہاتھوں میں آئے گی وہ اسی مخصوص عمارت کو دھاکر کر بیان پر ایک عمدہ قسم کا حلڈر ان پاک بزاوی گے۔ مگر جب بھی ایسا بہترالعینی ان کی پیٹھیں برف کی سلوں کی بجا تے کر سئی اقتدار پر جتیں تو حلڈر ان پاک کے لیے کوئی اور حجت تلاش کر لی جاتی اور یہ عمارت نظریہ صورت کے تحت اسی طرح اسی بڑی سرکار کے دیر نگرانی موجود رہتی کہ ہر حکومت کی ڈور پر کامیاب ڈالنے والے بھی موجود ہرتے اور انہیں سیدھا کرنے کے لیے اس عمارت کا دباؤ موجود رہتا۔ کہنے کاطلب

یہ ہے کہ یہ عمارت موجود تھی، اب بھی ہے اور تب تک رہے گی جب تک کہ ایک ایسی نسل سامنے نہیں آجائی جو سات کروڑ نئے پاؤں اور چیلینٹروں میں ٹھوس ناقہ زدہ پول کے لیے کجھ ایک عظیم چلدرن پاک نہیں بنادیتی۔ ہاں تو مجرموں کو یہاں صرف ٹھانی طور پر لاپا جاتا اور وہ چند روز یہاں خون مخوك کرایا پس ایک آدمی عضو ناکارہ کروانے کے بعد یہاں بالکل ہی فرت ہو جاتے کہ بعد یہاں سے باہر چلے جاتے گریا بلکہ اس یہاں ہمیشہ سے رہتا تھا۔

محکمہ سیاست کا ایک گائیڈ ملکی اور غیرملکی سیاسیوں کے ایک میلنے کو تاریخی عمارت کے سرخ شتروں، شیش محلوں، باغوں، دیوالوں اور زیبر زمین راستوں میں سے گھاٹا پھر آتا قدمی اسلحہ کے عجائب گھر میں داخل ہو گیا۔

”خواتین و حضرات“ اُس نے ٹمپوں، ٹکینز، نیزوں، تواروں، ڈھالوں، زدہ بھتروں وغیرہ کی جانب ان کی توجہ مبذول کروائی۔ یہ ٹکینز جھینیں ہرنے اپ پالش کرو لو کے ناش پر رکھا ہے، اخہیں اگر پخوا جائے تو خون کی ندیاں پہنچیں اور یہ ٹلواریں ریڑھ کی ٹھیوں میں سے یوں گذرتی تھیں جیسے مکن میں اُنگلی۔ ان توپوں کے دہاؤں پر باغیوں ..... معاف کیجیئے گا وطن پرستوں کو باندھ کر اڑا دیا جاتا تھا۔ اور یوں اُس زمانے کے حکمران ایک مستحکم اور مشبت حکومت بنانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ یہ دہمیا رہیں جن کی دہشت سے عوام فوج کے اگے بڑے ہو کر چلتے تھے گر بریت کے زمانے لرچے۔ آج کے تہذیب یا فتح عمدیں تو ان مظالم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً اس شکنچے کو لاحظ فرمائیے جو انگلیوں کو جوں میں داخل ہوتی گا جروں کی طرح کاٹ کر رکھ دیتا تھا۔ گراں تارے علی تو نہیں میں الیسی ایسی دفعات موجود ہیں کہ کوئی کسی کی جانب اُنگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ ہمیں پورا دگار کا شکر ادا کرنا چاہیے تکہ ہم اُس دھشمی عہد میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ ایک ترقی یا فتح معاشرے کی آزاد فضاؤں میں سانش لیتے ہیں۔ تاریخی عجائب گھر

صرف جبرا دنظام کی ایک یادگار کے طور پر مختزو کر لیا گیا ہے تاکہ ہم آج اپنی خوشخبرتی پر نازار ہو سکیں۔ ان زناوں میں صرف قاہر حکمران عوام پر ظلم ڈھانتے نہیں بلکہ فوج جنگیں رٹنے کے علاوہ معصوم شہزادیں کا قتل عام بھی کرتی تھی۔..... ذرا تصور کیجئے کہ.....

”کہ اس زمانے میں فوج جنگیں بھی رُلتی تھی؟“

بابا بیگلوں جب دن چڑھے سوکر امتحات اس نے حسبِ محول بادوچی خانے کا رُخ کیا اور وہیں بیٹھ کر پلی تنگ چائے کے گھونٹوں سے باسی روٹی کے چند نو ایسے پیٹ میں آتا رہیے۔ مچھروں حسبِ محول اپنی کوٹھری میں واپس آیا اور حسبِ محول ایک کونے میں بیٹھ کر حسبِ محول چھبت کو گھوڑنے لگا۔ کتنے ہزار دنوں سے وہ اس چھبت کو گھوڑا رہا تھا؛ اُسے یاد نہ تھا کسی کو بھی یاد نہ تھا۔ یادداشت کی نسبتیں کب چھوٹیں، کسے یاد تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے یہاں تھا۔ جیسے ان اُوچی اُوچی دلیاروں اور کوٹھڑیوں کے ہمراہ معماروں نے باہے بیگلوں کو بھی تعمیر کر دیا ہو۔ جتنا عرصہ صحن میں دھوپ پھیلتی رہتی وہ اپنے کوئی میں جبڑے مُتفق نہ کرے، منہ امتحانے بیٹھا رہتا، کبھی کبھار اپنی سفیدہ والدی کھلا کرمزہ لیتا اور پھر چھبت کو گھوڑنے لگتا۔ جب دھوپ صحن کی دلیاروں کوستہ سے ناپتی اور پُر اُٹھ جاتی تو وہ باہر نکل آتا اور ایک پر سیدہ ٹھاث پر الٹی پالتی اس کر بیٹھ جاتا اور اب نیلی چھت پر آنکھیں جادوتیا۔ اس کے اس پاس الہکار الاعظمی سے گزرتے رہتے۔ اپنے اپنے کاموں میں صروف، زخمی جسموں کو گھسیتی، کوٹھڑیوں میں پھیلتے ہوئے، چھتروں کی مرمت کرتے ہوئے، برف کے بلاک سر پر امتحانے جنیں لٹکے بد نوں کی گرمی سے پچھلانا ہوتا تھا وہ لا تلقی سے گزنتے رہتے جیسے باغ میں بخش پراؤ نگھتے کسی بوڑھے کے قریب سے فوجان جڑے لاپرواہ کو صروف رہتے ہوئے گز جاتے ہیں۔

ایک شام حسپ مہرل بابا بلگوس اپنی کو چھڑی میں سے آٹھ کر صحن میں آیا تو  
وہاں اُس کی بیٹھک والاٹاٹ موجود تھا اور بیکا ماشکی اپنے نشگے پاؤں پر نیم دائرے  
میں گھومتا ہوا بڑی مستحدی سے صحن میں چھڑ کاڑ کر رہا تھا۔  
مکسی باڈشاہ نے آنا ہے؟ ”بابے بلگوس کے لیے بندی خانے میں باہر سے  
آنے والے تمام افسر باڈشاہ تھے۔

بیکے ماشکی نے ملکیرے کے زم چڑے کو ایک جنسی پیشہ در کے میٹاںکی انداز  
میں چھکاتے ہوئے ”ہوں“ کیا اور پانی چھڑ کتا رہا۔

بابا اپنے ناٹ کے بخیری کرنے میں بیٹھ گیا اور آسمان کی جا تب دیکھنے لگا۔  
چھڑ کاڈ مکل ہڈا تو ایک صوف سیٹ اور حند کر سیاں برآمدے میں سجادی گئیں؛  
چھڑ کاڈ کرڈی کی بھی ہر قی ایک دوسرا تھی اٹھا کر لائے اور اُسے صحن کے دریاں  
میں نصب کر دیا۔ دوسرے یوں لگتا جیسے یہ سینڈ کسی متصور کے لیے وہاں رکھا  
گیا ہے اور وہ ابھی آئے گا اور اس پر کینس رکھ کر بندی خانے کی تصویر کشی شروع  
کر دے گا۔ مگر اس سینڈ پر تصویریوں کی سجلائے زندہ ماڈل رکھے جاتے تھے۔ اسی دوران  
چند بھاری بوڑوں والے بندی خانے والے بڑی سرکار کے ہمراہ آتے، اور بڑی مکار  
بھی اُن کے سامنے بھک کر چل رہی تھی اور وہ صوفوں پر بیجا جان ہو گئے۔ ان کے  
ہمراہ تارہ استری شدہ سفید کوٹ میں بلبرس ایک ڈاکٹر بھی خاچ جس کے لگے میں ایک  
شیختوں کو پہنچل رہی تھی، مروت کی مزاپانے والے مجرم کو دعاۓ غفرت فیٹے  
کے لیے دیر سے آئے والے تیز تیز چلتے مکی پادری کے لگے میں یہتھی صلیب کی  
طریقہ سب آپس میں گفتگو کرتے ہوئے بار بار تفہیقہ لگا رہے تھے۔ بھاری بُٹ  
کلا پھاڑ پھاڑ کر اور بڑی سرکار قدسے مختار ہو کر۔

”میرا خیال ہے اب شروع کر دیں“ ایک بھاری بُٹ نے سرکار سے  
نکھانا لجھے میں کہا۔

”سر اگر پہلے ایک کپ چاٹے کا ہو جاتے تو کیا حرج ہے، چار بجھے کو ہیں۔“

جب کا انتشار کئے بغیر بڑی سرکار کی گرجہ چائے تباور پی خانے تک پہنچی اور ایک الہکار چائے کی ٹرالی جگیے صحن پر گھسیتا چلا آ رہا تھا اگر اونچ موتے مجرموں کے جسموں کو گھسیتے صحن پر گھسیتا جائے تو زیادہ زور نہیں لگانا پرے گا۔ آئندہ روز چھپڑ کا ذہنا چاہیے، الہکار نے سوچا) چائے کے ساتھ دیگر دوازماں بھی نہیں۔  
 ”یہیک عذر ہے ہے“ بخاری بُرٹ اپنی موچھ پر سے ذرے صاف کرتے ہوئے بولا۔  
 ”مرے والی روڑ سے منگوایا ہے میرا پناہنده لے کر آیا ہے۔“

”میرا خیال ہے اب .....؟“

بڑی سرکار نے کوٹھردوں کی جانب ایک نظرِ مخصوص ڈالی اور جیسے اس نظر کی ہتھکڑی میں بندھا ہوا ایک قیدی کا جسم وہاں سے برآمد ہو گیا۔ اس کے پیچے پیچے دو سپاہی چل رہے تھے۔ ڈاکٹرنے فراؤ آٹھ کر قیدی کو آدمی راستے میں ہی جالیا جیسے اس کا استقبال کرنا چاہتا ہو۔ اس نے سرسری طور پر سینے کو مٹھنک بخار پیچے ٹرد کر دیکھا۔ ”کتنے؟“

بڑی سرکار نے ایک ڈکار کے درمیان میں ”پندرہ“ کا لفظِ تشکل ادا کیا۔  
 ”ٹھیک ہے“ ڈاکٹر نے فراؤ اسر ملا یا اور پھر جلدی سے واپس اُگر صوفے پر بیٹھ گیا جیسے اُسے ڈر ہو کر پیالی میں بقیہ باندھ چائے کہیں مٹھنڈی ہے ہو جائے۔  
 بڑی سرکار نے اب کی مرتبہ کوٹھردوں کی جانب ایک اور نظرِ مخصوص ڈالی اور وہاں سے تیل میں چڑا ایک لشکتا ہوا کر یہاں المنظرِ ادمی لگکٹ کو گردہ دیتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کوڑا تھا۔

قیدی کے تمام کپڑے اُتار کر اُسے ٹھنکلی سے باندھ دیا گیا۔ لگکٹ یہ نے بڑی سرکار کی جانب دیکھا اور ان کے سر ہلانے پر ٹھنکلی سے من موڑ کر دیوار کی طرف ڈگ بھرنے لگا۔ دیوار کے قریب بابا گلوس بیٹھا تھا۔ دیکھ رہا تھا، آسان کی طرف نہیں بلکہ اس نئے نمائشے کو۔

پچھلے پانچ چھ برسوں سے اس بندی خانے میں مجرموں کی آمد معمول کے مطابق

ہی تھی مگر اس کے بعد پچھلے چند ماہ میں اس ٹرینیک میں مرتبہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر کیدم گزیوں کی ایک صبح کو سپاہی عنایت نے بابے کو رازدارانہ لمحے میں بتایا کہ بڑی سرکار کی بڑی سرکار کو جیل میں ڈال دیا گیا ہے اور اس کی وجہ ایک اور بڑی سرکار نے لے لی ہے۔ چنانچہ اگھے روز میں چھکھے تمام قیدی رہا کر دیئے گئے۔ چند ہفتے بڑے امن و سکون سے گزرے۔ اہل کار سارا دن اونچھتے رہتے اور بندی خانے کی بڑی سرکار کا چھتر دھوپ میں ٹرا اکڑتا رہتا۔ مگر پھر کیس دم ٹرینیک جاری ہو گئی۔ جاری کیا ہو گئی باقاعدہ ٹرینیک جام ہو گیا۔ ایک ایک کو شہر تی میں درجنوں قیدیوں کو ٹھوٹسا جاتا اور بڑی سرکار نے متعدد نئے چھتروں کا آرڈر فری دیا۔ بقول سپاہی عنایت کے اتنی رونقیں اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔

لگوٹھی نے بابے بگوس کے قریب پہنچ کر کوڑے کو ایک جھکھا فے کر ٹھاٹھا چلا یا، پھر سکلی پر بندھے جسم کی نگلی پڑھ پر نظریں جما کر "یا علی" کا لغڑہ بلند کیا اور ایک بیانک قسم کے رقص کے ائے پئے نڈم اٹھاتا، اپنے جسم کو لرنا ہوا جا گا۔ تھی پیٹھ کے قریب جا کر کوڑا ہوا میں لہرایا مگر کیس دم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے محدود طلب انگھوں سے بڑی سرکار کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ چٹا واپس بابے بگوس کے قریب اک کھڑا ہوا۔ "یا علی" کا لغڑہ لگایا اور انہی مخصوص قدموں سے ڈگ زیگ کے انداز میں بھاگا مگر اس مرتبہ بھی دہنگی پیٹھ کی قربت میں پتھ کر کوڑا ہماں لہر لئے کے بعد کیدم کھڑا ہو گیا۔

بڑی سرکار نے بے حد شرمندہ ہو کر بخاری بُرُؤں کی جانب دیکھا اور پھر گرج کر کہا "اوٹے ماں کے کھسم اکیا ہو گیا ہے تھے؟" "سرکار پر بھیں نہیں رہی" لگوٹھی ازتے ہئے بولا "مولائے کرم سے اب فلٹی نہیں ہو گی مائی بابا۔"

دہ بڑا پیشیان چرو لیے بابے بگوس کے پاس والپس آیا۔ دوڑنے سے بھے اس کے چہرے کا رنگ مردی کا لا ہو گیا اور اس نے کیس دم مڑ کر بابے بگوس کی تگر

میں ایک ٹھٹدار سید کیا تھیں بھی کہوں کہ کوڑا اٹھانے سے پہلے آخری قدم ٹھیک کیوں نہیں پڑتا، یہ ماں کا بار جو یہاں مبیٹا ہوا ہے ..... سرکار میری دوڑپسے بیس قدموں کی ہوتی ہے اور یہ غبیث اسی بیسویں قدم پر مبیٹا ہوا ہے۔ اُنھوں نے .....“

بابا چکے سے اُنھوں کھڑا ہوا۔ لگوٹیئے نے ایک لشہ آور اطمینان سے ایک لیے باڈل کی طرح قیدی کی طرف دیکھا جسے معلوم ہے کہ اس کا بیس قدموں کا باڈل نگ شارٹ اب درست ہے اور وہ یقیناً کٹ اکھاڑے گا، نیچی پٹیجہ کا ماں اُنھیں دیکھ دے گا۔

بابا بگوس اپنی کو ٹھٹری میں آگیا اور بابر ہڑی سرکار اور بھاری بوتھ پاٹے پتی رہے، ایک کھاتے رہے اور پٹیجہ کا ماں اُدھرتے اُدھرتے باریک تیئے میں بدلتا رہا۔

بابا بگوس اس سے پیشہزادیت کی یہ شمار تحریری نشگے جسموں میں کھڈی ہوئی دیکھ چکا تھا یکیں یہ تماشہ نیا تھا۔ مگر چند ہی دلنوں میں یہ تماشہ بہت ہی پڑانا ہو گیا۔ روڑا نہ درجنزوں افراد کو کوٹے لگتے۔ ڈاکٹر اب باتا عددہ معاشرہ کرنے کی بجائے قیدی پر ایک نظر ڈال کر ”پنده کے لیے صحت مذہ سے“ کامن ٹھیکیت فے دیتا اور زناظر کی تعداد بھی کم ہوتی گئی۔ بایا یے کو اس نئے تاشے پر صرف ایک ہی اعتراض تھا، وہ شام ڈھلے اپنی کو ٹھٹری سے نکل کر صحن میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کیونکہ لگوٹیئے کا شارٹ بیس قدم کا تھا اور وہی بیسویں قدم بایا یے کی نشست گاہ بنتی۔

بابا بگوس ہمیشہ سے یہاں تھا، وہ یہاں قیدی تھا بھی اور نہیں بھی۔ وہ شادی کا ایک ایسا ہار تھا جسے پہنچنے والا دو لہا اب بڑھا ہو چکا تھا۔ یہ ہار تھانے کے کسی کو نے کھدرے میں پڑا ہے اُسے چھینکا بھی نہیں جا سکتا کہ

اس کے لیے کوئی جواز نہ تھا۔ ملکہ ہے پڑا رہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر وہ شادی کب ہوتی تھی کسی کو یاد نہ تھا۔

بابا بھروس اس بندی خانے میں کیوں آیا، کب آیا؟ اور اب یہاں کیوں ہے؟ ان سوالوں کا جواب بڑی سرکاریاں املاکاروں کے پاس نہ تھا اور اس کی وجہ نہایت سادہ تھی کہ جس زمانے میں ان سب سوالوں کے جواب موجود تھے اس زمانے میں اس بندی خانے میں موجود طریق سرکار اور املاکاروں لوگ تھے جو اب تک یا تو فوت ہو چکے تھے، یا ریٹائر ہو چکے تھے، یا پھر عک کے دوسرا بندی خانوں میں اہم خدمات انجام دے رہے تھے۔ جو بھی تی سکوار یہاں آتی تو پہلے روز معاشرے پر نسلتے ہی سب سے پہلا سوال جو املاکاروں سے پوچھا جاتا ہے یہی ہوتا کہ یہاں کب آیا؟ جواب "معلوم نہیں سرکار" میں ہوتا۔ "کب آیا؟"

"جی جس بھی آئے تو یہ ہیں پر موجود تھا۔"

"اب تک یہاں کیوں ہے؟" اس کا جواب بھی کچھ اس قسم کا ہوتا کہ سرکار کی رہائی کا حکم بھی نہیں آیا۔

اور یہ کیوں نہیں آیا؟ "اس کا جواب بہت آسان تھا۔ بڑی سرکار کے دفتر سے ملحتہ ایک ریکارڈ روم تھا جہاں اس بندی خانے میں آنے والے تمام "جرائم" پیشہ " افراد کا باقاعدہ ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اصولاً باقیے بھروس کے جرام کی نائل بھی میہیں ہوتی چاہیئے متنی مگر تھی نہیں۔ ہر نئی بڑی سرکار نے بلیے کے رعشہ زدہ حسم کو دیکھ کر حکم دیا کہ باقیے کی نائل ڈھونڈ کر لاو کر آخر یہ بزرگوار کس گناہ کی پاداش میں یہاں بند ہے۔ مگر وہ نائل کسی دستیاب نہ ہوتی اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی۔ اب چونکہ ہر مہذب ملک میں قانون کی حکمرانی ہوتی ہے اور قانون کے مطابق کسی شخص کو تسب تک رہا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کی نائل پر رہائی کے احکامات صادر نہ کیے جائیں اس لیے باقیے بھروس کو قانونی طور پر

را دراگر ہم قالون کی پاسداری نہ کریں تو ہم میں اور ورندوں میں کیا فرق رہ جاتے) رہا  
ہمیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ سے بیہان تھا۔ اس کی نقل و حرکت پر یعنی بندی خلیل  
کی مدد میں کرفی پانیدی نہ تھی۔ وہ جہاں جی چاہے آ جا سکتا تھا، ہرگز سے گفتگو کر  
سکتا تھا۔ تمام اہل بندی خانہ اس کے ساتھ ایک اہل خانہ کا سا سلوک کرتے تھے۔  
مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ کبھی بھی اس بندی خانہ سے باہر نہیں نکلا  
تھا کیجی سال چھپ ماہ بعد بابا بگلوں درواصل یہ اُس کا اصلی نام تو نہ تھا جو فائل گھم  
ہو جانے کی وجہ سے بابے کے علاوہ اور کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ پہلے پہل اسے  
صرف بابا کہا جاتا تھا۔ پھر ایک روز کسی المکار نے اس کے سفید سردار داڑھی سفید  
داڑھی کو کوئے میں دیکھا و میکھ کر کہا۔

”بابا تو وہ روز سے بگلا دکھائی دیتا ہے۔“

چنانچہ اسے بابا بگلا کہا جانے لگا جو بگڑتے بگڑتے بابا بگلوں ہو گیا) ہاں تو  
کبھی سال چھپ ماہ بعد بابا بگلوں چھپ ہو جاتا، بالکل خاموش ہو جاتا، کھانے کے  
لیے جو روٹی ملتی اُسے صحن میں بیٹھ کر چڑیوں اور کوڈوں کو کھلدا دیتا اور خود بالکل بُکھارا  
رہتا۔ رات کے وقت اپنی کوٹھڑی میں مسلسل ٹھپٹھپا رہتا۔ صحیح سریرے المکار  
ویکھتے کہ اس کی سفید داڑھی اُسنزوں سے بچڑھ رہی ہے اور وہ جان جاتے کہ یہی وہ  
دن ہے جب بابا بگلوں چکپے سے ان کے پاس آئے گا۔ اس کی بھیکی ہریں داڑھی  
ان کے گاؤں سے چھوٹے گی اور وہ شرمندہ سا ہر کر کئے گا۔ مجھے باہر لے چلو۔“  
چنانچہ صرف کارروائی پوری کرنے کی غرض سے دوپاہی اس کے ساتھ نہ تھی  
کہ دیجئے جاتے اور وہ بابے کو اس تاریخی عمارت سے باہر شہر میں لے جاتے۔ بابا  
بھرے پرے شہر کے شرمندہ بندگھڑیاں کی طرح خاموش، سر بُکھاتے مالتی حالت  
میں گھومتا رہتا اور کبھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتا کہ اس کے آس پاس، چار چھوڑی کیا  
ہو رہا ہے۔ پوسے ایک گھنٹہ کے بعد بابا اسی طرح چکپے سے ساپاہی کے کان  
میں سرگوشی کرتا۔ ”مجھے واپس لے چلو“ اور وہ اُسے واپس لے جاتے۔

حافظتی عملی کے ارکان، دیگر املاک اور بندی خلائق کی بڑی مسکار کی جیسی شدید خواہش نظری کربابے بگلوں کو کسی طرح رہا کر دیا جائے گرگم شدہ فائل ہمیشہ اٹھنے آجاتی۔ کل کلاں وہ فائل کہیں سے نمودار ہو جائے اور حکومت وقت پوچھ لے کہ فلاں بابا کیا گیا، تو پھر کیا ہو گا؟ چنانچہ ایک خاموش سارش کے تحت یہ ملے پاچکا خاکر بابے کی حفاظت بالکل دکی جائے اور اسے فرار ہونے کے قام تز مراثع میسر کیجئے جائیں مگر بابے نے اُنہیں ہمیشہ مایوس کیا اور اس مسئلے پر بالکل توجہ نہ دی۔ کچھ بوس پھٹے بابے بگلوں کی سالادہ یا ششماہی تجھے باہر لے چڑا۔ والی شہر کی سیر کے دوران پاہی عنایت نے اس کی مشتکرتے ہوئے کہا: ”بابا! آخر تم بھاگ کیوں نہیں جلتے؟“ بابے نے جھکا ہوا سر جھکا ہی سہنے دیا اور چلتا رہا۔

دوسرے پاہی صابر نے عنایت کی ہاں میں ہاں طائفی ہے و بھجو اگر تم بھاگ جاؤ تو ہم والپیں جا کر کہہ دیں گے کہ جی بابا فرار ہو گیا ہے اور تھارا کیس خود بخود ختم ہو جائے گا۔“

بابے نے سر جھکا تے رکھا۔

”یہ نہیں کہ قم ہم پر بوجہ ہو ہم تو تھیں ایک بزرگ کی طرح چاہتے ہیں مگر بابا یہ تھاری عمر ہے بندی خانے میں پڑا سڑنے کی..... بھاگ جاؤ۔“  
بابے نے سر اٹھایا اور سکلنے لگا۔

”بھاگ جاؤ؟“

”ہاں ہاں“ دونوں نے اس کی ہمت بڑھائی۔

”اچھا“ بابا منہ کھول کر بولا۔ ”لیکن بھاگتے کیسے ہیں؟“

پرساں سن کر دنوں سپاہی سرچ میں پڑ گئے اور پھر کیدم عنایت نے چمک کر کہا: ”وہ ایک سیاسی قیدی نہیں تھا جسے ہم نے الف نشگاہ کے صحن میں دملک گوانی نہیں۔ بس جیسے وہ بھاگنا تھا ناہ ہمارے چھتروں سے پچنے کے لیے دیے گئے...“  
بابے نے اپنے زین میں اُس نگئے دہشت زدہ کانپتے بدن کی تصویر بزندہ

کی اور پھر مرکھ جلا کر بولا۔ میں بپڑھا ہوں۔ مجھ میں تو سکت نہیں اُس طرح بھائی کی ہے  
”بایا یہ ضروری نہیں کہ تم اُسی طرح بھاؤ۔..... ہم ادھر کی سجائے اُدھر نہ  
موڑ لیتے ہیں اور تم بے شک آہستہ آہستہ چلتے اطینان سے سامنے والی گلی می غائب  
ہو جاؤ۔ ہم متحارا پچھا نہیں کریں گے، یہیں سے والپس چلے جائیں گے۔“  
بابے نے دارالحی متھی میں دبا کر جھٹکا سادیا جیسے نیصد کر لیا ہو، وہ میں قدم  
چلا مگر کھڑا ہو گیا۔

”اب کیا نہ رہے؟ صابر نے پوچھا۔

”میں اگر بھاگ ہی جاؤں تو پھر کیا ہو گا۔..... یعنی مجھے کیا ہو گا؟“

”تم آزاد ہو جاؤ گے بایا۔ آزاد۔.....؟“

”اچھا۔“ بابے نے پھر منہ کھول دیا۔ آزاد ہو کر انسان کیا ہو جاتا ہے؟“  
سپاہی صابر نے عنایت کی طرف شکستی نظر وہ سے دیکھا کہ جبھی اس  
سوال کا جواب تو تم سے دو۔ اس پر عنایت منہ پر ہاتھ رکھے بغیر زور سے  
کھانسا اور بابے کے قریب چلا گیا۔ ”مہنا کیا ہے..... میں آزاد ہو  
جاتا ہے۔“

صابر کو عنایت سے اتنی کندڑتی کی امید نہ تھی۔ چنانچہ اسے کندھے سے  
پکڑ کر ایک طرف کیا اور بابے سے کھنے لگا۔ آزادی کا بڑا سوار ہے بایا۔  
بندہ مفرغ چھوٹے کھا سکتا ہے، کون آئیں کریاں کھا سکتا ہے، منڈوا دیکھ سکتا  
ہے اور پھر آزاد انسان..... جہاں جی چاہے جائے.....“

”اور اگر نہ جانا چاہے تو؟“ بابے نے پوچھا۔

”تو نہ جائے۔“

”ایسا تو میں بندی خانے میں بھی کر سکتا ہوں۔“ بابا سکرانے لگا۔

”اوصرف یہی نہیں بابا بلکہ اس کے علاوہ بھی آزادی کے بڑے منے  
ہیں..... جسے چاہے ملے بتحارے رشتے دار بھی تو ہوں گے؟“

بابے نے چھر سر جھکایا۔  
دہ بھر حال بایاتم خدا کے لیے بھاگ جاؤ ॥ ان دونوں نے لاچار ہو کر منت  
کی ۔

بابے نے کندھے میگھرے اور چھر اسی رفتار سے آہستہ آہستہ چلنے لگا عنایت  
اور صاحب عنایت سنجیدہ چھر سے بنادر و سری جانب دیکھنے لگے۔ تقریباً دس منٹ  
کے وقت کے بعد جب انھوں نے ٹھڑک دیکھا تو بایا بلگوس دہاں موجود نہ تھا۔  
دونوں نے اطمینان کا ایک بہت ہی گہرا سائز لیا اور ہنسنے لگے۔ چھر عنایت بولا۔  
دو یہ پار صاحب اباۓ کے بغیر بندی خانہ لگے گا سونا شونا ..... اب چیزیں اپسیں  
جاکر روپرٹ لکھوا دیں گے کہ بایا بلگوس بالآخر فزار ہو گیا ہے۔ دیے ہوئی سرکار  
اس خبر سے خوش ہی ہو گی ॥

”نهیں ابھی واپس نہیں جاتے گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک دیکھنے کے بعد  
جائیں گے تاکہ روپرٹ میں کارروائی کے طور پر درج ہو جائے کہ ہم اُسے تلاش  
بھی کرتے رہے ہیں ॥“

اُس شام جب عنایت اور صایر اس تاریخی عمارت کی میٹھیاں طے کر رہے  
تھے تو انہیں اپنے پیچھے ہفت کی سی آداز آئی جیسے ایک تھکے ہوئے بھٹکے  
بلیڈاگ کے کھلے ہوئے منڈ سے برآمد ہوتی ہے۔ بایا بلگوس سر جھکائے لڑکھڑائی  
ٹانگوں کو بشکل سنبھالتا ان کے پیچے پیچے چلا آ رہا تھا۔ اس کی دارالحی آنزوں سے  
تر مخفی ۔

فزار کے اس عظیم منصوبے کی ناکامی کے بعد ہری سرکار اور الہکاروں نے  
بایا بلگوس کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ روٹین کے تابع اپنی کو ٹھڑری میں  
چھت کر اور شام کر صحن کے کرنے میں بیٹھ کر آسمان کو گھومنے میں دن گز اُسے  
لگاتا تاکہ اس سے صحن کا دہ کو نہ چھن نہیں۔ کیونکہ دہاں بیسوں قدم تھا اور انہیں ۱۰  
قدموں کے آغاز سے کوڑا اشر لائے تھے بھرتا ہتو اس طور نہیں لہرایا جا سکتا تھا کہ

نچی پیشی کا گوشت باریک ذرتوں والے دلخظرلوں میں بدل جائے۔  
 اپنی پسندیدہ نشست سے خودم ہونے کے چند شفتوں بعد بابا بلکوس ایک مرتبہ  
 پھر چپ ہو گیا۔ ہمانے کے لیے جو روٹی میں وہ چڑیوں اور کتوں کو کھلادی۔ رات کے  
 وقت کو ٹھہری میں ٹھہرتا رہا اور صبح سوریہ عنایت کے گھان سے آنسوؤں سے  
 بھیگی ہوئی داڑھی چھپتی۔ مجھے باہر لے چلو۔“

اس روز شہر میں شور تھا۔

شور تو پسلے بھی ہوتا تھا مگر آج زیادہ تھا اور زیادہ سور تھی ہوتا ہے جب  
 لوگ بھی زیادہ ہوں۔ وہ سب شہر کی ایک بڑی سڑک پر واقع جیل ہانے کی جانب  
 رواں تھے۔ بابا بلکوس حب عادت سرنپوڑائے چلتا رہا۔ کئی لوگ اس کے بوڑھے  
 جسم کو دھکیلتے ہوئے آگے نکل رہے تھے، انھیں یہ قراری نے ڈساہرًا تھا دو بھے  
 کا وقت نئے مواعظ اور صرف تین گھنٹے یا تی سو تھے۔ عنایت اور صابر بھی یابے کے ہمراہ  
 میکانی کھلنوں کی طرح چلتے رہے۔ وہ اس کی سالانہ یا ششماہی سیر کے لطف میں  
 کم سے کم حائل ہوتا چاہتے تھے۔ سچوم زیادہ ہوتا چلا گیا۔ بالآخر بابے کو زکنا پڑا کہ  
 اس کے آگے جسم کی دلیاری میں تھیں۔ اُس نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر عنایت سے پُچھا  
 ”آج عید ہے؟“

”نبیں بابا!“ عنایت مکرا یا ”عید ہوتی تو صبح حلہ ملابندی خانے میں۔“  
 ”وہ تینوں ہجوم کی دراڑوں میں سے پھنس پھنس کر نکلتے ہوئے آگے ٹڑھتے تھے۔  
 آنس کریم والوں کو صد افسینے کی حاجت نہ ظہی کران کے ہاتھ ریڑھیوں کے  
 سرخانوں میں ڈوبتے نکلتے تھاک رہے تھے۔ مشروبات کی بوتوں کے کریڈی ڈلیوی  
 ڑک سے اترتے اترتے فروخت ہو جاتے۔ پان سگر ٹویں کے عارضی کھکھے فٹ پاٹھ  
 پر سمجھتے سمجھتے خالی ہو رہے تھے۔ جلیم کی دلیگیں ہجوم مجھوں کے باراتیوں کی طرح چٹ  
 کر رہا تھا۔ کئی خاندان ہجوم سے ہٹ کر درختوں تک پہنک منار ہے تھے کہہ عقائد

نہتے اور دوپہر کا کھانا ساختنے کے لئے کارکنے تھے۔ اس پاس کی تمام دکانیں بند تھیں کہ دکاندار بھی آج موج میلے کے موڑ میں نہتے۔ بھلارا وزر ایسا تماشہ دیکھنے کو کہاں ملتا ہے مگر پریمیا نکلی ٹرینیک کی مانع تھت کردی گئی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہو سکیں۔ میدان تحریر پہلے سے ہی انسانوں کے سروں سے بھرا ہوا تھا، لیکن اردو گرد کی عمارتوں پر نظر ڈالنے سے شک ہوتا تھا کہ وہ ایلوٹوں کی بجائے جسموں سے بنی ہوئی ہیں۔ لاکھوں کا مجمع نخاک کے لفظی شہر اس وقت ویران ٹپا تھا۔ شیرخوار بچوں کی حوصلہ مند ماہیں انھیں چادروں میں چھپا کر دو وہ ملاری، مختیں گروڑیوں پر کھڑے ہونے سے اور بھوم کے سروں کے اوپر دیکھنے کی جستجو میں یہ کام قدسے دشواری سے سرانجام پا رہا تھا۔ قریب ہی ایک سماں میں عمارت کا طبق تھا اور اس کاٹھیکیدار دوڑ پہنچنے کی حساب سے لوگوں کو بلے کے ڈھیر پر کھڑا ہونے کے اجازت نامے نہیں دہا تھا۔ ڈھیر سطح زمین سے ظاہر ہے بلند ہوتا ہے اور اس پر کھڑے ہو کر منظر صاف نظر آتا ہے وہاں سے پچھلے دو دنوں میں تمیز شدہ چبوترے اور ان پر نصب شدہ لکڑی کے چوکھے صاف نظر آتے ہے تھے اور چوکھوں سے پھنسنے لگکر ہے تھے۔

جیسا کہ مہذب مکون میں دستور ہوتا ہے پابندی وقت کو محدود کھا گیا اور پرے دنبجھے جیل کے اندر سے ایک جیپ فوراً رہوئی۔ قاتلوں کے ہاتھ پشت پر بند ہے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں تھیں۔ انھیں چبوتروں پر کھڑا کر دیا گیا۔ مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ وہ اپنے اپنے پھندوں کے سامنے کھڑے ہوں جو شاید گردن کی مرثائی کے حساب سے بنائے گئے تھے۔ جمع ملک طور پر چامڑے ہرگیا۔ بایا بگھوں تو پہلے سی خاموش تھا۔ پہلے قاتلوں کے چہروں پر نقاب فالے گئے۔ ان کے کندھے کپڑا کر انھیں پھندوں کے عین نیچے لے جایا گیا اور پھر اہتمامی احترام سے یہ پھندے باری باری ان کی گرد نوں کے گرد کس دیئے گئے۔ بھوم پر نائل کی چادر زخمی ہوئی تھی۔ کیدم دہ فائل جو چند و قبول انسان کملاتے تھے ان

کے پاؤں تھے سے کڑی کے تنخزوں کی زمین کھسک گئی اور رُوہ ہوا میں جھوٹنے لگے۔  
 ستائے کی چادر اُس لمحے تاریخ ہوتی اور ہجوم کے ایک حصے نے پاکیزہ جذبات  
 سے منور ہو کر نعروہ تند بیب بلند کیا اور لوگ کے چاڑی پھاڑ کر زندہ با دندنہ باد کے  
 نعرے لگا کر ڈواب میں شریک ہونے لگے۔ وہ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے مبیر  
 کی آنکھوں میں آنسو تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں یہ پاکیزہ منظر دیکھ لیا۔ قاتلوں  
 کے جسم پھر کتے تھے اور پھر ڈھیسے پڑ جاتے تھے جیسے بکرے کا  
 تازہ ذبح شدہ گوشت پھر کتا ہے اور ساکت ہو جاتا ہے۔ جیسے لندی میں چپسی چھلی کی  
 ڈم بار بار پھر لتی ہے۔ ان کا سائنس منقطع ہوتے پر، گردن کے منکے ٹوٹنے سے  
 اذیت کی جو لہریں فضایاں میں پھیل رہی تھیں وہ ہجوم کے لیے حیاتِ جادو دانی کی  
 ہوا میں تھیں، وہ انھیں ٹوٹ گئے ہے تھے، اپنے بدن کے پروں میں جذب کر  
 رہے تھے اور مزید پر جو شش ہو رہے تھے۔ وہ انصاف کا تماشا دیکھنے آئے تھے،  
 ایک نئے نظام کے آغاز کے چشم دیدی گواہ بننے آئے تھے کہ اس عبرتِ انیز منظر کے بعد  
 ملک میں قاتلوں، ڈاکوؤں، بردہ فروشوں کی نسل ختم ہو جانی تھی۔ یہ وہ نمک تھا جو ان  
 کیچوپوں پر طوال دینے سے وہ بھیشہ کے لیے تخلیل ہو جاتیں گے۔ آج کے بعد جرم  
 ایک ایسا الفظ ہوا گا جو صرف کتابوں میں ملے گا اور پھر کون نہیں جانتا کہ ایسا ہی ہوا  
 لوگ اسی لیے تو آئے تھے، آخری قاتل کو دیکھنے کے لیے۔ وہ عبرت حاصل کرنے کے  
 ساتھ ساخت فقتوں کے درمیان نفرے بھی لگا رہے تھے اور قاتلوں کے، ملک کی تاریخ  
 میں آخری قاتلوں کے جسم پھر کر رہے تھے۔ جوں جوں نیم مردہ گوشت کے وظہ  
 نہنڈے ہوتے گئے، ہجوم کی مایوسی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ جسم  
 سدا یوپنی پھر پھرا تے رہیں۔ وہ کل ناشتہ کر کے بیان آئیں تو یہ جسم اسی طرح پھر کر  
 رہے ہوں۔ پھر وہ اپنے دفتر پاکارو بارے نارغ ہو کر شام کو ادھر سے گزیں۔ ب  
 بھی یہ بدن کسی انماڑی رقصہ کی طرح ہل رہے ہوں۔ چھٹی کے دو زیوچوں کے ساتھ یہ  
 سامنے والے باغ میں سیر کے لیے آئیں تو یہ لفکتے ہوئے بکرے پھر بھی حرکت میں ہوں۔

آخر ان کے چہروں پر نقاب کیوں ڈالے گئے تھے نقاب نہ سوتے تو وہ ان کی زبانوں کو باہر لٹکتا دیکھ سکتے، پیاسے نکتوں کی لمبی لٹکتی زبانوں کی طرح۔ ان کی آنکھیں اُب مکارا ہر جاتیں۔ شاید ایک آوہ کی آنکھ کا ڈھیلہ ٹوٹ کر گر جاتا اور وہ اُسے پھون کے کھینے کے لیے اٹھا لے جاتے۔ وہ آخری دنوں پر ان کے ہر نشیں کی نیل روزش کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے گلوں میں سے نکلنے والی خڑخاہیت بھی سنتا چاہتے تھے اور یہ ممکن ہو سکتا تھا اگر ان کے قریب طاقتور مائیک فٹ کر دیتے جاتے (یہ ان کے گلوں کے ساتھ باندھ دیتے جاتے) اور پورے علاقے میں لاوڈ پیکر لگا دیتے جلتے انتظامیہ کو اس قسم کی کوتا ہی آئندہ نہیں کرنی چاہیئے، مگر آئندہ کا گیا مطلب، آئندہ تو کوئی قاتل ہو گا ہی نہیں۔

قاتل چندوں سے جھومن رہے تھے اور تماشائی خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا روزہ روزہ ان لٹکتے جسموں کے پاؤں دلوچ کر انہیں اور زور سے چھلاتے، خود جھولا جھولتے، ان کے ٹھنڈے سے پڑتے جسموں کی پینگوں کے ساق جھونلا جھلا دیتی۔ اور اب تو ان جسموں نے ترپنیا چھوڑ دیا تھا۔ کتنے احمق لگ رہے تھے وہ، جیسے پارسل لٹک رہے ہوں۔ جیل کے ڈاکٹرنے گھر می پر نظر ڈالو، اور پارسلوں کو مشمول کر انہیں مزدہ قرار دے دیا۔ ان کے جسم چندوں سے علیحدہ کر دیتے گئے۔ تماشے کا کینڑیں عبرت کی تصویر سے خالی ہو گیا۔ ہجوم ڈبر جاتا ہوا بکھر نے لگا۔

”یار جگہ بہت کم تھی۔ ٹھیک طرح سے دکھانی ہی نہیں دیا۔ سٹیڈیم میں انتظام کر دیتے۔ بیشک ٹکٹکا دیتے اور اس آمدی سے کوئی فلاحی ادارہ قائم کر دیا جاتا، ایک فلاحی ملکت قائم کرنے کا آسان ترین لمحہ“

بیشتر لوگ موت کی تیز رفتاری کو کوس رہے تھے۔

”تین چار منٹ کی پھر پھر اہست اور ہیں۔ اگر کرٹ میچ ٹیکوٹھیں پر دکھایا جاسکتا ہے تو ان قاتلوں کی موت کو میل کا سٹ کیوں نہیں کی گیا؟“

تمان اس طرح کر دڑوں لوگ عبرت حاصل کرتے۔ کم از کم نخارہ تو قریب سے

ہوتا ہم ان کے چہروں کو گپٹ کو زمیں دیکھتے۔ بلکہ ان تین چار منٹوں کو بھی اسی طرح  
نی دی پر دکھایا جانا چاہیے تھا جیسے کسی بیشی میں کی وکٹ اڑنے پر اسی نظر کو  
دوبارہ سلو موشن میں دکھاتے ہیں۔“

”کم از کم چھ سات کی مرے ہوتے۔ ایک کمیرہ ان کی آنکھوں کا کلوز لیتا۔ دوسرے  
نھتوں پر ہوتا، نیسا ہنٹوں پر۔ چوتھا پرے جسم کا شاتٹ لیتا اور سب سے اہم  
پانچواں جو صرف گردنوں کا گپٹ گپٹ کلوز لیتا اور یوں سلو موشن میں آنکھیں کیا جائیں  
وھیرے مکلتی چلی جاتیں اور شاید وہ ڈھیلا بھی باہر آ جاتا تو اس نظر کو فراؤ دوبارہ  
دکھایا جاتا بہت ہی سلو موشن میں۔ نھتوں پر جو کمیرہ ہوتا اُس کی تصویر بھی خوب ہوتی۔  
آہستہ آہستہ پھیلتے اور رکڑتے نہتھے۔ کہتے ہیں کہ مت سے پیشتر ناک سے خون  
بھی جاری ہو جاتا ہے۔ کم از کم یہ بھی حقی طور پر معلوم ہو جاتا اور ہونٹ سلو موشن میں  
کس طرح وھیرے دھیرے پھٹ پھڑاتے جیسے پھول کھل رہا ہے۔ آخری لمحوں میں دُ  
بنیے پڑ جاتے۔“

”ہاں مگر یا رشیلیو شیرن پر کیسے پتہ چلا کہ ہونٹ نیلے پڑے ہیں؟“  
”اس کا حل تو خیر موجود ہے کہ اللہ کے فضل سے ہمارے لئک میں زیگنیں نشایات  
بھی تو ہوتی ہیں۔ میں زیگنیں کمیروں کو نسب کیا جاتا۔ یہ تمام پُر لطف مناظر تو اپنی جگہ  
گر اصل کلانکس تو گردنوں والے سین پر ہوتا۔ رُبُّ کی طرح آہستہ آہستہ لمبی ہوتی  
ہوئی گردنوں کا۔ ٹیلی دشیں پر آنے سے پہلے میک اپ بھی تو ضروری ہوتا ہے،  
تو دُہ پھالنسی کے چوتھے سے پر انھیں کھڑا کر کے کیا جا سکتا تھا۔ لٹتا ہے کہ میک اپے  
تصویر زیادہ صاف آتی ہے۔ جیسا آندہ می، مگر آندہ تو.....“

”ہجوم کھڑتا گیا۔ پان ٹھرٹھوں کے کھڑکے اٹھائے جانے لگے۔ آئس کرم کی  
رشیلیو شیر کی جانش سر کئے گئیں۔ علیم والے اپنی بھری جھیریں پر ہاتھ رکھے خالی  
زیگنیں ریڑھوں پر لدوار ہے نتھے۔ سامنے والی سڑک پھر سے ٹریفک کے لیے کھول  
دمی گئی۔ زندگی نارمل ہو گئی۔“

بیا بگو سب حسب عادت سارا وقت سر جھکاتے کھڑا رہا۔ عنایت اور صابر بچلے  
تین گھنٹوں سے ایک ہی مقام پر کھڑے تھے کچھے نئے ناموں نے بابے کی جانب  
دیکھا تو گم نہ ہے ڈھیلے چڑھے کھڑا تھا۔

”بابا اب واپس چلیں؟“ عنایت نے آرام سے پوچھا۔

بابے نے جیسے سنا ہی نہیں اسی طرح چب کھڑا رہا۔

قدرتے وقت کے بعد عنایت نے اُس کے کندھے پر اٹھ رکھا۔ بیا بگلوں!

اب واپس چلیں؟“

بابے کے جگہ ہوتے چرس سے لکھتی داڑھی آنسوؤں سے پخرا رہی تھی۔ اس  
نے سر اٹھایا نہیں بس ہوئے سے کہا۔

”نہیں، اب باہر اور اندر کا موسم ایک ہو چکا ہے۔“